

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

العصر

(١٠٣)

العصر

نام | پہلی آیت کے لفظ العصر کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانہ نزول | اگرچہ مجاہد، قتادہ اور مقاتل نے اسے مدنی کہا ہے، لیکن مفسرین کی عظیم اکثریت اسے مکی قرار دیتی ہے۔ اور اس کا مضمون یہ شہادت دیتا ہے کہ یہ مکہ کے بھی ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہوگی جب اسلام کی تعلیم کو مختصر اور آتھماں دل نشین فقروں میں بیان کیا جاتا تھا، تاکہ سننے والے ایک دفعہ ان کو سوس کر بھولنا بھی چاہیں تو نہ بھول سکیں، اور وہ آپ سے آپ لوگوں کی زبانوں پر چڑھ جائیں۔

موضوع اور مضمون | یہ سورۃ جامع اور مختصر کلام کا بے نظیر نمونہ ہے۔ اس کے اندر چند چھٹے الفاظ میں معنی کی ایک دنیا بھر دی گئی ہے جس کو بیان کرنے کا حق ایک پوری کتاب میں بھی مشکل سے ادا کیا جاسکتا ہے۔ اس میں بالکل دو ٹوک طریقہ سے بتا دیا گیا ہے کہ انسان کی فلاح کا راستہ کون سا ہے اور اس کی تباہی و بربادی کا راستہ کون سا۔ امام شافعی نے بہت صحیح کہا ہے کہ اگر لوگ اس سورۃ پر غور کریں تو یہی ان کی ہدایت کے لیے کافی ہے۔ صحابہ کرام کی نگاہ میں اس کی اہمیت کیا تھی، اس کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن جعفر التماری ابو بکرؓ کی روایت کے مطابق اصحاب رسول اللہ علیہ وسلم میں سے جب دو آدمی ایک دوسرے سے ملنے تو اس وقت تک جدا نہ ہوتے جب تک ایک دوسرے کو سورۃ عصر نہ سنا لیتے (طبرانی)۔

آيَاتُهَا ۳

سُورَةُ الْعَصْرِ مَكِّيَّةٌ

رُكُوعُهَا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَالْعَصْرِ ۱۰ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۲۰ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَّصَوْا بِالْحَقِّ ۱۱ وَتَوَّصَوْا بِالصَّبْرِ ۱۲

زمانے کی قسم، انسان درحقیقت بڑے خسارے میں ہے، سوائے اُن لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے، اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔

۱۵ اس سورۃ میں زمانے کی قسم اس بات پر کھائی گئی ہے کہ انسان بڑے خسارے میں ہے، اور اس خسارے سے صرف وہی لوگ بچے ہوئے ہیں جن کے اندر چار صفیوں پائی جاتی ہیں: (۱) ایمان - (۲) عمل صالح - (۳) ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرنا - (۴) ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرنا۔ اس کے ایک ایک جز کو الگ لے کر اس پر غور کرنا چاہیے تاکہ اس ارشاد کا پورا مطلب واضح ہو جائے۔

جہاں تک قسم کا تعلق ہے، اس سے پہلے بار بار ہم اس بات کی وضاحت کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوقات میں سے کسی چیز کی قسم اُس کی عظمت یا اُس کے کمالات و عجائب کی بنا پر نہیں کھائی ہے، بلکہ اس بنا پر کھائی ہے کہ وہ اُس بات پر دلالت کرتی ہے جسے ثابت کرنا مقصود ہے۔ پس زمانے کی قسم کا مطلب یہ ہے کہ زمانہ اس حقیقت پر گواہ ہے کہ انسان بڑے خسارے میں ہے سوائے اُن لوگوں کے جن میں یہ چار صفیوں پائی جاتی ہوں۔

زمانے کا لفظ گزرتے ہوئے زمانے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، اور گزرتے ہوئے زمانے کے لیے بھی جس میں حال و حقیقت کسی لمبی مدت کا نام نہیں ہے۔ ہر اُن گزر کر ماضی بنتی چلی جا رہی ہے، اور ہر اُن اگر مستقبل کو حال اور جا کر حال کو ماضی بنا رہی ہے۔ بیان چونکہ مطلقاً زمانے کی قسم کھائی گئی ہے، اس لیے دونوں طرح کے زمانے اُس کے مفہوم میں شامل ہیں۔ گزرتے ہوئے زمانے کی قسم کھانے کا مطلب یہ ہے کہ انسانی تاریخ اس بات پر شہادت دے رہی ہے کہ جو لوگ بھی ان صفات سے خالی تھے وہ بالآخر خسارے میں پڑ کر رہے اور گزرتے ہوئے زمانے کی قسم کھانے کا مطلب سمجھنے کے لیے پہلے یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ جو زمانہ اب گزر رہا ہے وہ دراصل وہ وقت ہے جو ایک ایک شخص اور ایک ایک قوم کو دنیا میں کام کرنے کے لیے دیا گیا ہے۔ سانس کی مثال اُس وقت کی سی ہے جو امتحان گاہ میں طالب علم کو پرچے حل کرنے کے لیے دیا جاتا ہے۔ یہ وقت جس نیز رفتاری کے ساتھ گزر رہا ہے اس کا اندازہ غھڑی دیر کے لیے اپنی گھڑی میں سیکنڈ کی سوئی کو حرکت کرتے ہوئے دیکھنے سے آپ کو ہو جائے گا۔ حالانکہ ایک سیکنڈ بھی وقت کی بہت بڑی مقدار ہے۔ اسی ایک سیکنڈ میں روشنی ایک لاکھ



جیسا ہی ہزار میل کا راستہ طے کر لیتی ہے، اور خدا کی خلق میں بہت سی چیزیں ایسی بھی ہو سکتی ہیں جو اس سے بھی زیادہ تیز رفتار ہوں خواہ وہ ابھی تک ہمارے علم میں نہ آئی ہوں۔ نہ نام اگر وقت کے گزرنے کی رفتار وہی سمجھ لی جائے جو گھڑی میں سیکنڈ کی سوئی کے چلنے سے ہم کو نظر آتی ہے، اور اس بات پر غور کیا جائے کہ ہم جو کچھ بھی اچھا یا بُرا فعل کرتے ہیں اور جن کاموں میں بھی ہم مشغول رہتے ہیں سب کچھ اُس محدود مدتِ عمر ہی میں وقوع پذیر ہوتا ہے جو دنیا میں ہم کو کام کرنے کے لیے دی گئی ہے، تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا اصل سرمایہ تو یہی وقت ہے جو تیزی سے گزر رہا ہے۔ امام رازی نے کسی بزرگ کا قول نقل کیا ہے کہ ”میں نے سورہ عصر کا مطلب ایک برف فروش سے سمجھا جو بازار میں آواز نکارتا تھا کہ رحم کر دو اُس شخص پر جس کا سرمایہ گھٹلا جا رہا ہے، رحم کر دو اُس شخص پر جس کا سرمایہ گھٹلا جا رہا ہے۔ اُس کی یہ بات سن کر میں نے کہا یہ ہے وَالْعَصْرِ إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكْفُورٌ کا مطلب۔ غم کی جو مدت انسان کو دی گئی ہے وہ برف کے گھٹنے کی طرح تیزی سے گزر رہی ہے۔ اِس کو اگر ضائع کیا جائے، یا غلط کاموں میں صرف کر ڈالا جائے تو یہی انسان کا خسارہ ہے۔ آپس گزرتے ہوئے زمانے کی قسم کھا کر جو بات اس سورہ میں کہی گئی ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ تیز رفتار زمانہ شہادت دے رہا ہے کہ ان چار صفات سے خالی ہو کر انسان جن کاموں میں بھی اپنی مُہلتِ عمر کو صرف کر رہا ہے وہ سب کے سب خسارے کے سودے ہیں۔ نفع میں صرف وہ لوگ ہیں جو ان چاروں صفات سے منصف ہو کر دنیا میں کام کریں۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے ہم اُس طالب علم سے جو امتحان کے مقررہ وقت کو اپنا پرچہ حل کرنے کے بجائے کسی اور کام میں گزار رہا ہو، کرسے کے اندر لگے ہوئے گھنٹے کی طرف اشارہ کر کے کہیں کہ یہ گزرتا ہوا وقت تیار رہا ہے کہ تم اپنا نقصان کر رہے ہو، نفع میں صرف وہ طالب علم ہے جو اس وقت کا ہر لمحہ اپنا پرچہ حل کرنے میں صرف کر رہا ہے۔

انسان کا لفظ اگرچہ واحد ہے، لیکن بعد کے فقرے میں اُس سے اُن لوگوں کو نشانی کیا گیا ہے جو چار صفات سے منصف ہوں، اس لیے الاحوال یہ ماننا پڑے گا کہ یہاں لفظ انسان اجم جنس کے طور پر استعمال کیا گیا ہے اور اُس کا اطلاق افراد، گروہوں، اقوام، اور پوری نوعِ انسانی پر کیا گیا ہے۔ پس یہ حکم کہ مذکورہ چار صفات سے جو بھی خالی ہو وہ خسارے میں ہے، ہر حالت میں ثابت ہوگا خواہ اُن سے خالی کوئی شخص ہو، یا کوئی قوم، یا دنیا بھر کے انسان۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ہم اگر یہ حکم لگائیں کہ زہر انسان کے لیے مُہلک ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ زہر ہر حالِ مملک ہے خواہ ایک فرد اس کو کھائے، یا ایک پوری قوم، یا ساری دنیا کے انسان مل کر اسے کھا جائیں۔ زہر کی مُہلک خاصیت اپنی جگہ اٹل ہے، اُس میں اس لحاظ سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ایک شخص نے اس کو کھا یا ہے، یا ایک قوم نے اسے کھانے کا فیصلہ کیا ہے، یا دنیا بھر کے انسانوں کا اجماع اس پر ہو گیا ہے کہ زہر کھانا چاہیے۔ ٹھیک اسی طرح یہ بات اپنی جگہ اٹل ہے کہ چار مذکورہ بالا صفات سے خالی ہونا انسان کے لیے خسارے کا موجب ہے۔ اس قاعدہ کلیہ میں اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کوئی ایک شخص اُن سے خالی ہے، یا کسی قوم نے، یا دنیا بھر کے انسانوں نے کفر، بد عملی، اور ایک دوسرے کو باطل کی ترغیب دینے اور بندگیِ نفس کی تلقین کرنے پر اتفاق کر لیا ہے۔

اب یہ دیکھیے کہ خسارے کا لفظ قرآن مجید کس معنی میں استعمال کرتا ہے۔ نفع کے اعتبار سے خسارہ نفع کی ضد ہے، اور تجارت میں اِس لفظ کا استعمال اُس حالت میں بھی ہوتا ہے جب کسی ایک سودے میں کھانا آئے، اور اُس حالت میں بھی جب

سارا کاروبار گھانٹے میں جا رہا ہو، اور اُس حالت میں بھی جب اپنا سارا سرمایہ کھو کر آدمی دیوالیہ ہو جائے مگر قرآن مجید اسی لفظ کو اپنی خاص اصطلاح بنا کر فلاح کے مقابلے میں استعمال کرتا ہے، اور جس طرح اُس کا تصور فلاح محض دنیوی خوشحالی کا ہم معنی نہیں ہے بلکہ دنیا سے لے کر آخرت تک انسان کی حقیقی کامیابی پر حاوی ہے، اسی طرح اُس کا تصور خسار بھی محض دنیوی ناکامی یا خستہ حالی کا ہم معنی نہیں ہے بلکہ دنیا سے لے کر آخرت تک انسان کی حقیقی ناکامی پر حاوی ہے۔ فلاح اور خسار، دونوں کے قرآنی تصور کی تشریح اس سے پہلے ہم متعدد مقامات پر کر چکے ہیں اس لیے اُن کے اعادے کی حاجت نہیں ہے (ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم، الأعراف، حاشیہ ۹۔ الأنفال، حاشیہ ۳۰۔ یونس، حاشیہ ۲۲۔ بنی اسرائیل، حاشیہ ۱۰۲۔ جلد سوم، الحج، حاشیہ ۱۔ المؤمنون، حواشی ۱۳۱۔ ۱۱۱۔ ۵۰۔ جلد چہارم، لقمان، حاشیہ ۴۔ الزمر، حاشیہ ۳۲۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لی جا چاہیے کہ اگرچہ قرآن کے نزدیک حقیقی فلاح آخرت میں انسان کی کامیابی، اور حقیقی خسار وہاں اُس کی ناکامی ہے، لیکن اس دنیا میں بھی جس چیز کا نام لوگوں نے فلاح رکھ چھوڑا ہے وہ دراصل فلاح نہیں ہے بلکہ اُس کا انجام خود اسی دنیا میں خسار ہے، اور جس چیز کو لوگ خسار سمجھتے ہیں وہ دراصل خسار نہیں ہے بلکہ اس دنیا میں بھی وہی فلاح کا ذریعہ ہے۔ اس حقیقت کو قرآن مجید میں کئی مقامات پر بیان کیا گیا ہے اور ہر جگہ ہم نے اس کی تشریح کر دی ہے (ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، النحل، حاشیہ ۹۹۔ جلد سوم، مريم، حاشیہ ۵۲، طہ، حاشیہ ۱۰۵۔ جلد ششم، اٰیٰت، حواشی ۳-۵)۔ پس جب قرآن پورے زور اور قطعیت کے ساتھ کہتا ہے کہ ”درحقیقت انسان بڑے خسارے میں ہے، تو اس کا مطلب دنیا اور آخرت دونوں کا خسارہ ہے، اور جب وہ کہتا ہے کہ اس خسارے سے صرف وہ لوگ بچے ہوئے ہیں جن کے اندر حسب ذیل چار صفات پائی جاتی ہیں، تو اس کا مطلب دونوں جہانوں میں خسارے سے بچنا اور فلاح پانا ہے۔

اب ہمیں اُن چاروں صفات کو دیکھنا چاہیے جن کے پائے جانے پر اس سورۃ کی رو سے انسان کا خسارے سے محفوظ رہنا موقوف ہے۔

ان میں پہلی صفت ایمان ہے۔ یہ لفظ اگرچہ بعض مقامات پر قرآن مجید میں محض زبانی اقرار ایمان کے معنی میں بھی استعمال کیا گیا ہے (مثلاً النساء، آیت ۱۳۷، المائدہ، آیت ۵۴، الأنفال، آیت ۲۰، ۲۱، التوبہ، آیت ۳۸، اور الصف، آیت ۲ میں)، لیکن اس کا اصل استعمال بچے دل سے ماننے اور یقین کرنے کے معنی میں کیا گیا ہے، اور عربی زبان میں بھی اس لفظ کے یہی معنی ہیں۔ اُتت میں اٰمَنَ لَہُ کے معنی ہیں صَدَّقَہُ وَاَعْتَمَدَ عَلَیْہِ (اس کی تصدیق کی اور اُس پر اعتماد کیا)، اور اٰمَنَ بِہِ کے معنی ہیں اٰیْقَنَ بِہِ (اُس پر یقین کیا)۔ قرآن دراصل جس ایمان کو حقیقی ایمان قرار دیتا ہے، اُس کو ان آیات میں پوری طرح واضح کر دیا گیا ہے:

مومن تو حقیقت میں وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول

پر ایمان لائے اور پھر شک میں نہ رہے۔

جس لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اس

پر ڈٹ گئے۔

مومن تو حقیقت میں وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا

رَبَّنَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ

ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا۔ (المحرات - ۱۵)

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا۔

(آخر السجدۃ - ۳۰)

رَبَّنَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ

وَجَدْتُمْ قُلُوبَهُمْ - (الأنفال ۲)

وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ -

(البقرة ۱۷۵)

فَلَا دَسَائِكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّى يُؤْمِنُوا بِكَ
فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيَّ
أَنْفُسَهُمْ حَرْجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيَسْئَلُوكَ
تَسْلِيمًا -

(النساء ۶۵)

جائے تو ان کے دل لرز جاتے ہیں۔

اور جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ سب سے بڑھ
کر اللہ سے محبت رکھتے ہیں۔

پس نہیں، (اسے نبی، تمہارے رب کی قسم وہ ہرگز
مومن نہیں ہیں جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں
تمہیں فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ
کرد اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں
بلکہ سرسبز تسلیم کر لیں۔

ان سے بھی زیادہ اس آیت میں زبانی اقرار ایمان اور حقیقی ایمان کا فرق ظاہر کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اصل
مطلوب حقیقی ایمان ہے نہ کہ زبانی اقرار:

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، ایمان لاؤ اللہ اور

اس کے رسول پر۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَ

رَسُولِهِ - (النساء ۱۳۶)

اب رہا یہ سوال کہ ایمان لانے سے کن چیزوں پر ایمان لانا مراد ہے، تو قرآن مجید میں پوری طرح اس بات کو بھی کھول کھول
کر بیان کر دیا گیا ہے۔ اس سے مراد اولاً، اللہ کو ماننا ہے۔ محض اُس کے وجود کو ماننا نہیں بلکہ اُسے اس حیثیت سے ماننا ہے کہ وہی
ایک خدا ہے۔ خدائی میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ وہی اس کا مستحق ہے کہ انسان اُس کی عبادت، بندگی اور طاعت بجالائے۔ وہی
قسمتیں بنانے اور بگاڑنے والا ہے۔ بندے کو اس سے دعا مانگنی چاہیے اور اسی پر توکل کرنا چاہیے۔ وہی حکم دینے اور منع کرنے
والا ہے۔ بندے کا فرض ہے کہ اُس کے حکم کی اطاعت کرے اور جس چیز سے اُس نے منع کیا ہے اُس سے رک جائے۔ وہ سب
کچھ دیکھنے اور سننے والا ہے۔ اُس سے انسان کا کوئی فعل تو درکنار، وہ مقصد اور نیت بھی مخفی نہیں ہے جس کے ساتھ اُس
نے کوئی فعل کیا ہے۔ ثانیاً، رسول کو ماننا، اس حیثیت سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا مامور کیا ہوا احادی و رہنما ہے، اور جس چیز کی تعلیم
بھی اُس نے دی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، برحق ہے، اور واجب التسلیم ہے۔ اسی ایمان یا رسالت میں ملائکہ، انبیاء
اور کتب الہیہ پر، اور خود قرآن پر بھی ایمان لانا شامل ہے، کیونکہ یہ اُن تعلیمات میں سے ہے جو اللہ کے رسول نے دی ہیں۔
ثالثاً آخرت کو ماننا، اس حیثیت سے کہ انسان کی موجودہ زندگی پہلی اور آخری زندگی نہیں ہے، بلکہ مرنے کے بعد انسان
کو دوبارہ زندہ ہو کر اٹھنا ہے، اپنے اُن اعمال کا جو اُس نے دنیا کی اس زندگی میں کیے ہیں خدا کو حساب دینا ہے، اور اس
مخاسبہ میں جو لوگ نیک قرار پائیں انہیں جزاء، اور جو بد قرار پائیں اُن کو سزا ملنی ہے۔ یہ ایمان اخلاق اور سیرت و کردار کے
لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم کر دیتا ہے جس پر ایک پاکیزہ زندگی کی عمارت قائم ہو سکتی ہے۔ ورنہ جہاں سر سے یہ ایمان
ہی موجود نہ ہو وہاں انسان کی زندگی خواہ کتنی ہی خوشنما کیوں نہ ہو، اُس کا حال ایک بے شک کے جہاز کا سا ہوتا ہے جو موجوں
کے ساتھ ہتا چلا جاتا ہے اور کہیں قرار نہیں پکڑ سکتا۔

ایمان کے بعد دوسری صفت جو انسان کو خسار سے بچانے کے لیے ضروری ہے وہ صالحات (نیک کاموں) پر عمل کرنا ہے۔ صالحات کا لفظ تمام نیکیوں کا جامع ہے جس سے نیکی اور بھلائی کی کوئی قسم چھوٹی نہیں رہ جاتی۔ لیکن قرآن کی رو سے کوئی عمل بھی اُس وقت تک عمل صالح نہیں ہو سکتا جب تک اُس کی جڑ میں ایمان موجود نہ ہو، اور وہ اُس ہدایت کی پیروی میں نہ کیا جائے جو اللہ اور اس کے رسول نے دی ہے۔ اسی لیے قرآن مجید میں ہر جگہ عمل صالح سے پہلے ایمان کا ذکر کیا گیا ہے اور اس سورہ میں بھی اُس کا ذکر ایمان کے بعد ہی آیا ہے۔ کسی ایک جگہ بھی قرآن میں ایمان کے بغیر کسی عمل کو صالح نہیں کہا گیا ہے اور نہ عمل بلا ایمان پر کسی اجر کی امید دلائی گئی ہے۔ دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایمان وہی معتبر اور مفید ہے جس کے صادق ہونے کا ثبوت انسان اپنے عمل سے پیش کرے۔ ورنہ ایمان بلا عمل صالح محض ایک دعویٰ ہے جس کی تردید آدمی خود ہی کر دیتا ہے جب وہ اس دعوے کے باوجود اللہ اور اس کے رسول کے بنائے ہوئے طریقے سے مڑ کر چلتا ہے۔ ایمان اور عمل صالح کا تعلق بیچ اور درخت کا سا ہے۔ جب تک بیج زمین میں نہ ہو، کوئی درخت پیدا نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر بیج زمین میں ہو اور کوئی درخت پیدا نہ ہو رہا ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ بیج زمین میں دفن ہو کر رہ گیا۔ اسی بنا پر قرآن پاک میں جتنی بشارتیں بھی دی گئی ہیں انہی لوگوں کو دی گئی ہیں جو ایمان لاکر عمل صالح کریں، اور یہی بات اس سورہ میں بھی کہی گئی ہے کہ انسان کو خسار سے بچانے کے لیے جو دوسری صفت ضروری ہے وہ ایمان کے بعد صالحات پر عمل کرنا ہے۔ بالفاظ دیگر عمل صالح کے بغیر محض ایمان آدمی کو خسار سے نہیں بچا سکتا۔

مذکورہ بالا دو صفیوں تو وہ ہیں جو ایک ایک فرد میں ہونی چاہئیں۔ اس کے بعد یہ سورۃ دو مزید صفیوں بیان کرتی ہے جو خسار سے بچنے کے لیے ضروری ہیں، اور وہ یہ ہیں کہ یہ ایمان لانے اور عمل صالح کرنے والے لوگ ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کریں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اول تو ایمان لانے اور نیک عمل کرنے والوں کو فرد فرد بن کر نہیں رہنا چاہیے بلکہ اُن کے اجتماع سے ایک مومن و صالح معاشرہ وجود میں آنا چاہیے۔ دوسرے، اس معاشرے کے ہر فرد کو اپنی یہ ذمہ داری محسوس کرنی چاہیے کہ وہ معاشرے کو بگڑنے نہ دے، اس لیے اُس کے تمام افراد پر یہ فرض مائدہ ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو حق اور صبر کی تلقین کریں۔

حق کا لفظ باطل کی ضد ہے اور بالعموم یہ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک، صحیح اور سچی اور مطابق عدل و انصاف اور مطابق حقیقت بات، خواہ وہ عقیدہ و ایمان سے تعلق رکھتی ہو یا دنیا کے معاملات سے۔ دوسرے، وہ حق جس کا دارکنا انسان پر واجب ہو، خواہ وہ خدا کا حق ہو یا بندوں کا حق یا خود اپنے نفس کا حق۔ پس ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان کا یہ معاشرہ ایسا ہے جس نہ ہو کہ اُس میں باطل سے اٹھارہا ہو اور حق کے خلاف کام کیے جا رہے ہوں، مگر لوگ خاموشی کے ساتھ اس کا تماشا دیکھتے رہیں، بلکہ اس معاشرے میں یہ روح جاری و ساری ہے کہ جب اور جہاں بھی باطل سر اٹھائے کلمہ حق کہنے والے اس کے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوں، اور معاشرے کا ہر فرد صرف خود ہی حق پرستی اور راستبازی اور عدل و انصاف پر قائم رہنے اور حق داروں کے حقوق ادا کرنے پر اکتفا نہ کرے بلکہ دوسروں کو بھی اس طرز عمل کی نصیحت کرے۔ یہ وہ چیز ہے جو معاشرے کو اخلاقی زوال و انحطاط سے بچانے کی ضامن ہے۔ اگر یہ روح کسی معاشرے میں موجود نہ رہے تو وہ

خُسران سے نہیں بچ سکتا اور اس خُسران میں وہ لوگ بھی آخر کار مبتلا ہو کر رہتے ہیں جو اپنی جگہ حق پر قائم ہوں مگر اپنے معاشرے میں حق کو پامال ہوتے دیکھتے رہیں۔ یہی بات ہے جو سورہ مائدہ میں فرمائی گئی ہے کہ بنی اسرائیل پر حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی اور اس لعنت کی وجہ یہ تھی کہ ان کے معاشرے میں گناہوں اور زیادتیوں کا ارتکاب عام ہو رہا تھا اور لوگوں نے ایک دوسرے کو برے افعال سے روکنا چھوڑ دیا تھا (آیات ۷۸-۷۹)۔ پھر اسی بات کو سورہ اعراف میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے کہ بنی اسرائیل نے جب حکم کھلا بُنت کے احکام کی خلاف ورزی کر کے مچھلیاں بیکڑنی شروع کر دیں تو ان پر عذاب نازل کر دیا گیا اور اُس عذاب سے صرف وہی لوگ بچائے گئے جو اس گناہ سے روکنے کی کوشش کرتے تھے (آیات ۱۶۳ تا ۱۶۶)۔ اور اسی بات کو سورہ انفال میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ جو اُس فتنے سے جس کی شامت مخصوص طور پر صرف اُنہی لوگوں تک محدود نہ رہے گی جنہوں نے تم میں سے گناہ کیا ہو (آیت ۲۵)۔ اسی لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو امت مسلمہ کا فریضہ قرار دیا گیا ہے (آل عمران ۱۰۴) اور اُس امت کو بہترین امت کہا گیا ہے جو یہ فریضہ انجام دے (آل عمران ۱۱۰)۔ حق کی نصیحت کے ساتھ دوسری چیز جو اہل ایمان اور ان کے معاشرے کو خسارے سے بچانے کے لیے شرط لازم قرار دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اس معاشرے کے افراد ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرتے رہیں۔ یعنی حق کی پیروی اور اس کی حمایت میں جو مشکلات پیش آتی ہیں، اور اس راہ میں جن تکالیف سے، جن مشقتوں سے، جن مصائب سے، اور جن نقصانات اور محرومیوں سے انسان کو سابقہ پیش آتا ہے ان کے مقابلے میں وہ ایک دوسرے کو ثابت قدم رہنے کی تلقین کرتے رہیں۔ ان کا ہر فرد دوسرے کی ہمت بندھاتا رہے کہ وہ ان حالات کو صبر کے ساتھ برداشت کرے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد ششم، العصر، حاشیہ ۱۶، السبلد، حاشیہ ۱۴)۔